مجاز کے بعد کی رات

۷ دسمبر کی شام کوئی چھ بجے کے بعد جب ہم لوگ ''جگمگاتی جاگتی سڑکوں'' پہ پھرنے کے لیے نکلے تو ایک ریسٹورنٹ کا ریڈیو چیخا.... ''کل صبح بلرام پور اسپتال لکھنؤ میں اسرار الحق مجاز صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر پینتالیس سال تھی۔''

یہ خبر ریڈیو پاکستان لاہور کے دیہاتی پروگرام میں چوہدری عبداللطیف مسافر نظامی صاحب نے پنجابی زبان میں سنائی۔ بیوی نے یہ سن کر کہا:

''یہ تو ایک روز ہونا ہی تھا۔ اور پیو شراب۔ دیکھا اس لیے میں شراب پینے کے خلاف ہوں لیکن تم لوگ تو بچوں سے زیادہ ضدی ہو۔ کسی کی سنتے تھوڑی ہو۔ ایک وہ تمہارے میراجی تھے۔ پھر منٹو ہزار سمجھانے بجھانے پر بھی باز نہ آئے اور اس سے پہلے اختر شیرانی کا تم سناتے ہو کہ یہی حال تھا۔ یا تو آدمی جوش کی طرح پیتا ہو اور پینے کی حد مقرر کر لے اور جوش صاحب کی اس نظم سے عبرت حاصل کرے جو انہوں نے مجاز پر لکھی یا پھر شراب کو حرام سمجھے۔ تم لوگوں کے کھانے کو روٹی تو ہوتی نہیں اور پینے پہ تل جاتے ہو اور پھر خود بھی روتے ہو اور دوسروں کو بھی ساتھ رلاتے ہو۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو نہ تن پہ کپڑا کوئی ڈھنگ کا ہے، نہ پیٹ میں روٹی، چلیے گھر۔''

میں نے بیوی سے کہا تم نہ وقت دیکھو نہ محل بس ناصح مشفق بننے سے کام رکھتی ہو۔ یہ وقت نصیحتیں کرنے کا ہے۔ میں اس وقت گھر ہرگز نہیں جاؤں گا...... کہنے لگیں میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ گھر چل کر عصمت کا وہ مضمون نکال کر پھر سے پڑھیے جو انہوں نے مجاز پر لکھا ہے۔

میں نے گھر جانے پہ ترغیب بھی رد کر دی اور کہا: ''مجھے اس وقت ایک ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو میری طرح اس خبر سے متاثر ہوا اور میرے اس وقت کے غم میں شریک ہو سکے۔ میں ایسے ساتھی

کی تلاش میں جا رہا ہوں، تم گھر واپس چلی جاؤ۔ بچے کا ساتھ ہے اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔''

بیوی نے کہا اچھا، اتنا ہوش ابھی آپ کو ہے اور پھر کہا: میں سمجھ گئی آپ کہاں جا رہے ہیں، چلیئے ہم بھی چلتے ہیں۔ اکیلا اس وقت میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چنانچہ ہم لوگ ایسے ساتھی کے ہاں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ وہ تنہا بیٹھے دیوان بیدل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ خبر سنی تو دیوان بیدل چھوڑ کر دل پکڑ کر بیٹھ گئے اور جب انہیں پتہ چلا کہ موت اسپتال میں ہوئی تو کہنے لگے۔

کیا دِوانے نے موت پائی ہے

یہ اشارہ تھا اصل میں اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی طرف جو مجاز اپنی زندگی میں ہر ہوٹل اور ریسٹورنٹ میں جا کر پڑھتے تھے کہ۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اور مجاز جب یہ شعر پڑھتے تھے تو ان کا وہ لہجہ نہیں ہوتا تھا جس لہجے میں اکبر الہ آبادی نے یہ شعر کہا ہے بلکہ یہ شعر پڑھتے وقت ان کے لہجے میں ایسی زندگی سے ایک اکتاہٹ نمایاں ہوتی تھی جس میں کوئی گھر ہو نہ در۔ اس شعر میں مجاز نے اپنے پڑھنے کے انداز سے عجیب معنی پیدا کر دیئے تھے۔

مجاز صاحب کے ان دوست نے کہا: ذرا سوچیے مجاز کے والدین پر اس وقت کیا گزری ہوگی، خاص کر ماں کے دل پر۔ ابھی ان کی والدہ صفیہ کا داغ اٹھا چکی ہیں کہ یہ اور تازہ گھاؤ لگا۔ نفیس میری رفیقہ حیات نے بیچ میں لقمہ دیا...... ''یہ صفیہ ہی تھیں، جاں نثار اختر کی رفیقہ حیات''۔ سبط حسن صاحب نے میری بیوی سے مخاطب ہو کر کہا: ''صاحب میرا اور مجاز کا پورے پچیس برس کا ساتھ تھا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں اس وقت کیسی کیسی ہنگامہ خیز شامیں یاد آ رہی ہیں جو ہم لوگوں نے ساتھ گزار دیں اور پھر ابھی تو اور کتنی ہی ایسی شامیں گزارنے کا خیال تھا۔ کتنی امیدیں تھیں اس جواں سال شاعر سے ابھی ہم لوگوں کو۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بڑا نقصان ہو گیا اور بہت بے وقت۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چند ادیبوں کی ایک ٹولی مجاز کا پرسا دینے یہاں آ پہنچی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ کراچی سے ہوائی ڈاک سے جو اخبارات شام کو لاہور پہنچتے ہیں ان میں یہ خبر چھپی ہے اور ہم لوگ یہ خبر پڑھ کر سیدھے یہیں چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ صحافی قسم کے لوگوں نے

اپنے اپنے اخباروں کے نمائندوں کی حیثیت سے مجاز اور اس کی زندگی کے کچھ حالات دریافت کرنے شروع کر دیئے اور مجھے جب اس قسم کی پوچھ گچھ سے کچھ وحشت سی ہونے لگی تو میں نے سبط حسن صاحب سے اجازت چاہی۔ مجاز صاحب کے یہ دوست ہمیں چھوڑنے دروازے تک آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر کہا، اب میں فیض کے ہاں جاتا ہوں۔ لاہور میں میرے علم میں مجاز کے اس وقت دیرینہ دوستوں میں سے صرف وہی ایک ایسے دوست ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر یہ غم کچھ بٹ سکتا ہے۔ ہم لوگ یہاں سے نکل کر اپنے گھر کی جانب چلے ہی تھے کہ ایک ایسے صاحب علم مل گئے جن سے حال ہی میں شان الحق حقی صاحب دہلوی نے میرا تعارف اپنے لاہور کے حالیہ دورے میں کرایا تھا اور تاکید کی تھی کہ ان سے ملتے رہا کرنا...... میں اس دن کے بعد سے اتفاق سے آج پہلی دفعہ ان سے ملا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا آپ نے کچھ سنا۔ میں نے کہا ہاں سن لیا، اس سانحہ کو کس نے نہیں سنا۔ کہنے لگے تو پھر چلیئے میرے ہاں کچھ مجاز کی باتیں کریں اور اس تلخ حقیقت کی تلخی کچھ دور کرنے کی کوشش کریں۔ کہنے لگے مجھے حقی صاحب اس وقت بے طرح یاد آرہے تھے۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔ نفیس نے راستے میں پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ میں نے جواب دیا مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا بہرحال ایک دوست ہیں، دوست کے دوست، چلو ذرا سی دیر ان کے ہاں بیٹھتے ہیں۔ نفیس نے کہا انہیں اپنے ہاں کیوں نہ لے چلیں۔ میں نے کہا یہ بات تمہیں پہلے کہنی چاہیے تھی، چلو اب ٹھیک ہے۔ ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ چند خواتین کا ایک مختصر سا ہجوم ریڈیو سیٹ کے قریب سر جوڑے بیٹھا ہے۔ ریڈیو کی آواز سن کر میرے اور ان صاحب کے منہ سے بیک وقت ایک چیخ سی نکلی...مجاز۔ ایک خاتون نے منہ پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم لوگ جہاں تھے وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اور کان ریڈیو کی آواز کی طرف لگ گئے۔ مجاز اپنی مشہور نظم پڑھ رہے تھے۔

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں
ایک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

اور بغیر کسی اعلان کے مجاز نے یہ نظم پڑھنی شروع کی۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

اس نظم کے اختتام کے بعد اعلان ہوا کہ یہ سری نگر کشمیر ہے۔ مجاز کے اس کلام کے ساتھ ہماری آج کی تیسری مجلس برخاست ہوئی...... سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا یہ سری نگر تھا! ان صاحب نے جن کا نام یاد نہیں آرہا ہے ان خواتین سے پوچھا کب سے ہو رہا تھا یہ پروگرام؟ اور تم نے سری نگر کیسے لگایا؟ ایک خاتون نے جواب دیا ہم لوگ جب سے مجاز کی خبر سنی ہے اس کوشش میں تھے کہ کہیں سے کوئی پروگرام اگر ان پر ہو رہا ہو تو سنیں۔ لاہور، کراچی، راولپنڈی، آزاد کشمیر، دلی، بمبئی، لکھنؤ..... سارے اسٹیشنوں پر سوئی گھما گھما کر دیکھی لیکن کہیں سے مجاز پر کچھ نہ سنا۔ پھر سری نگر لگایا تو سنا کہ ان کے اسٹوڈیو میں تیار کیے ہوئے ریکارڈ پیش کیے جانے کو ہیں۔ اور آدھ گھنٹہ یہ پروگرام ہوا ہے۔ اچھا! آدھ گھنٹے کے ریکارڈ مجاز کے سری نگر ریڈیو کے پاس ہیں۔ یہ تو بہت قیمتی سرمایہ ہے ان کے پاس۔ شان الحق کے دوست نے کہا۔ ایک نسبتاً معمری خاتون بیچ میں بولیں: آخر جنت ہی سے ان کی آواز آئی نہ، حق مغفرت کرے...... بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خاتون کشمیری ہیں اور خاص سری نگر کی رہنے والی ہیں۔ اپنے وطن کی جنت میں واپس پہنچنے کے لیے دن رات مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔ ان خاتون کو شاید خوش کرنے کے لیے ایک لڑکی نے کشمیر جنت نظیر پر جوش ملیح آبادی کی یہ رباعی سنائی جو انہوں نے اس وقت کہی تھی جب وہ مجاز کے ساتھ پہلی مرتبہ کشمیر گئے تھے۔

ممنوع طرب سے لطف پیہم لینے
عصیاں کے درخت کی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو کاشمیر آ پہنچا جوش
اللہ سے انتقام آدم لینے

شان الحق صاحب کے دوست بولے کتنے عجیب طریقے سے اس رباعی میں جوش نے کشمیر کو جنت کہا ہے۔ کشمیری خاتون پھر بولیں..... ہائے وہ کشمیر جسے مفاد پرستوں نے اب وادی جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ پاکستان تو پاکستان خود ہندوستان کے لوگ بغیر پرمٹ کے اب وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ توبہ استغفار.....اور پھر ان خاتون نے بغیر تعارف کے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجاز صاحب، چودھری محمد علی ردولوی کے ہم وطن تھے..... میں نے کہا جی ہاں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ

مجاز نے ہم سب کا غائبانہ تعارف کرا رکھا ہے اور جیسے اب رسمی تعارف کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہی۔ میں سوچنے لگا یہ ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار کیسی کیسی خوش مذاق خواتین کا محبوب تھا۔ لیکن اس کے باوجود عورت وہی عورت جس کے لیے جوش نے کہا ہے ۔

آہ عورت......! کہاں ہے تو عورت!
ہم کو لاکھوں میں ایک بھی نہ ملی

اس عورت کے لیے مجاز زندگی بھر کیسا ترستا رہا۔ مجاز نشے میں چور ہونے کے باوجود اپنے بے تکلف احباب کی محفل میں اکثر اپنے ایسے اشعار سناتے تھے جو بڑا شاعر اپنے بے تکلف احباب میں سنانے کے لیے کہتا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں سے ایک شعر یہ تھا ۔

موت بھی اس لیے گوارا ہے
موت آتا نہیں ہے آتی ہے

اور آخر رات بھی آئی کہ مجاز تنگ آ کر موت کی آغوش گوارا کر لی ۔

نا امیدی اس کی دکھا چاہیے

یہاں سے ہم لوگ باہر نکلے تو خلیل صاحب مل گئے۔ ''لمحے'' کے مصنف محمد خلیل الرحمٰن صاحب جن کا دیوان ''لمحے'' دنیا کے شاعروں کے مختصر ترین دیوانوں میں سے ہے۔ خلیل صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا آپ تو کچھ مغموم سے نظر آ رہے ہیں حالانکہ یہ موقع خوش ہونے کا ہے۔ آپ مجاز صاحب ہی کی خبر سے رنجیدہ ہیں نا..... تو بات یہ ہے کہ یہ ٹارچ جتنی تیز روشنی سے اور جتنے عرصے سے متواتر جل رہی تھی اسے آخر اسی طرح ختم ہونا تھا۔ بینتالیس سال ایسی زندگی کے بہت سمجھنے چاہئیں جن میں ایک شخص نے ''آہنگ''، ''شب تار'' اور ''ساز نو'' جیسے '' تین چار دیوان پسماندگان کی ہدایت کے لیے چھوڑ دیئے۔ ٹمٹماتے ہوئے دیئے لیے جو لوگ گوشہ عافیت میں بیٹھے رہتے ہیں وہ اگر عمرِ نوح بھی پائیں تو کس کام کی جنہیں قدم قدم پر یہ تلقین کرنی پڑے کہ ۔

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

وہ ٹارچ جو آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرے گی اور گھپ اندھیروں میں روشنی بکھیرتی رہے گی آخر ایک دن اس کے ''سیل'' یکلخت ختم ہوں گے ہی۔ کب تک یہ بیٹری کام دے سکتی تھی۔ میں نے کہا خلیل صاحب آپ تو اپنی جگہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ فکر ہیں۔ خلیل صاحب کہنے لگے: خیر یہ آپ

محض اخلاق برت رہے ہیں اور اخلاق زیادہ نہ برتا کیجئے۔ ورنہ یہ بھی ایک دن یونہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا جب روشنی ہی ختم ہو گئی تو اخلاق کب تک رہے گا۔ خلیل صاحب نے کہا کہ صاحب اخلاق اندھیرے ہی میں تو دیکھا جاتا ہے اور ہم نے محسوس کیا کہ واقعی سڑکیں روشنیاں گل ہو جانے کی وجہ سے یکا یک بھیانک اور تاریک ہو گئی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا رہا جیسے بقول فراق۔

وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محو خواب نہیں

گیارہ بج چکے تھے اور ہم خلیل صاحب سے رخصت ہو کر گھر پہنچنے کی جلدی میں تھے کیونکہ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور بچہ بھی ساتھ تھا کہ مسافر صاحب گھر جاتے ہوئے مل گئے۔ مسافر صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ بھئی آپ لوگ مع بچے کے اس ٹھنڈ میں کہاں گھومتے پھر رہے ہیں؟ نفیس نے کہا اس کی وجہ آپ ہیں۔ نہ آپ وہ مجاز والی خبر سناتے اور نہ ہم لوگ اس وقت آپ کو یوں بے وقت یہاں ملتے۔ آپ کے منہ سے جب سے یہ خبر ریڈیو پر سنی ہے یونہی اوانی تو آئی ہم لوگ پڑے پھر رہے ہیں۔ مسافر صاحب نے کہا اصل میں اس عمر میں جب کوئی مر جائے تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چالیس برس ہی کی عمر میں تو جا کر انسان اس لائق ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کچھ کام کر سکے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ پیغمبری کا دعویٰ زیادہ تر پیغمبروں نے چالیس سال کی عمر سے پہلے نہیں کیا اور چونکہ شاعری جز دیست از پیغمبری۔ اس حساب سے مجاز صاحب نے صرف پانچ برس کی عمر پائی اور جن لوگوں کا مقصد حیات انسانیت کی بھلائی ہو ان کے لیے پانچ برس تو کیا پچاس برس بھی کم ہیں اور عمر گنی جاتی ہے چالیس برس کے بعد سے۔ اس قسم کی باتیں کرتے کراتے ہم لوگ گھر پہنچے تو دروازے ہی میں ایک کاغذ پڑا ہوا ملا۔ یہ پرچہ ایک رسالہ کے ایڈیٹر نے لکھا تھا۔ دیکھنے مجاز پر جو مضمون آپ لکھیں گے وہ ہمارے لیے ہو گا۔ اور میں یہ پرچہ پڑھ کر اس سوچ میں پڑ گیا کہ مجاز پر مضمون لکھنا کوئی منہ کا نوالا تو ہے نہیں اور پھر جتنی فرصت اس مضمون کے لکھنے کے لیے چاہیے وہ مجھ جیسے فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں، میں گرفتار کو کہاں نصیب!

بستر پر لیٹ کر ساری رات میں نے اسی سوچ میں آنکھوں میں کاٹ دی۔ کیسی کیسی ہنگامہ پرور شامیں آنکھوں میں پھر گئیں۔ وہ دلی کے کافی ہاؤسوں اور مئے کدوں میں گذری ہوئی شامیں جس میں مجاز جاں نثار اختر، جذبی، شان الحق حقی، شاہد لطیف اور کبھی کبھی ساغر نظامی وغیرہ بیٹھ کر گھنٹوں دنیا جہاں کے مسائل پر اپنے اپنے انداز میں رائے زنی کرتے۔ دلی کے کتب خانہ علم و ادب سے جب ہم

لوگ اٹھتے بلکہ اٹھتے کیا اٹھا دیئے جاتے، چاہے کتنی ہی دھواں دار بحث کسی موضوع پر ہو رہی ہو، الحاج حافظ سید وصی اشرف مالک کتب خانہ علم وادب اردو بازار دلی آٹھ بجتے ہی شاہد صاحب مدیر ماہنامہ ''ساقی'' سے مخاطب ہو کر کہتے چلیئے بھائی شاہد۔ اور ان کے اس اعلان پر سب کو ہڑ بڑ کر اٹھنا پڑتا۔ پھر یار لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے۔ کھانے والوں کی ٹکڑی الگ پھٹ جاتی اور پینے والوں کی الگ۔ کھانے والوں میں یعنی ان لوگوں میں جنہیں یہاں سے اٹھتے ہی بھوک ستانے لگتی تھی ظفر قریشی، فضل حق قریشی، صلاح الدین قریشی، میجر محمد میاں، جاذب قریشی واحد قریشی، غرض یہ کہ قبیلہ قریش کے زیادہ تر افراد پیش پیش رہتے تھے۔ اور یہ سب کسی ایسے ریسٹورنٹ کا رخ کرتے تھے جہاں ان کی مرضی کا کھانا ان کو ملے لیکن سید انصار ناصری، بھائی شاہد (مدیر ماہنامہ ''ساقی'')، تابش دہلوی چاہے پیتے یا نہ پیتے کبھی کھانے والے ٹکڑی کے ساتھ رہتے اور کبھی پینے والوں کی ٹولی کا ساتھ دیتے۔

میں سوچتا رہا رات بھر۔ کیا فرصتیں تھیں اس زمانے میں ہم لوگوں کو اور کتنی فراغت...... کیسی کیسی دھومیں، ہم لوگ مل کر مچاتے تھے۔ جس شام سب مل کو کسی کا گانا سننے جب نکلتے تو مجاز صاحب کے برجستہ اشعار اور فقرے سونے پر سہاگے کا کام کرتے۔ مجاز جب کسی کو دیکھ کر کہتے۔

مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

تو جی چاہتا کہ کسی کا گانا سننے کی بجائے مجاز کا کلام سنا جائے اور چنانچہ اکثر یہی ہوتا کہ بجائے گانا سننے کے مشاعرہ ہو جاتا۔ مجاز صاحب سے ایک دن ن م راشد نے کہا یار تم جب سناتے ہو پرانی ہی چیز سناتے ہو۔ کبھی کوئی نئی نظم یا غزل بھی تو سنایا کرو...... تو مجاز نے کہا۔ ابھی میری پرانی ہی نظمیں لوگوں کو یاد نہیں ہوئیں۔ میں نئی نظم جب کہتا ہوں جب دیکھ لیتا ہوں کہ جتنا میں اب تک کہہ چکا ہوں وہ سب کو زبانی یاد ہو گیا۔ ایک دفعہ ایک بے قافیہ ردیف کی شاعری بلکہ بقول بھائی شاہد کے چھوٹی بڑی شاعری کے ایک مبلغ نے مجاز سے کہا کہ لیجیئے مجاز صاحب، ایک غزل ہم نے بھی کہی ہے لیکن بڑی مشکل سے یہ چند شعر ہوئے ہیں۔ مجاز نے کہا ہاں صاحب قافیہ ردیف کا خیال رکھ کر برابر کے مصرعے کہنا بڑا مشکل ہے۔ ان صاحب نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا لیکن یہ غزل کہنے میں مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ مجاز صاحب نے اس پر کہا ہاں اگر انسان موزوں طبع ہو تو پھر غزل کہنے

میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ مجاز کی اس قسم کی باتیں یاد کرتے کرتے میں نے سوچا کہ میں پہلی دفعہ مجاز سے کب کہاں اور کیسے ملا تھا؟...... لیکن وہ جو جوش نے کہا ہے کہ۔

نسیاں مجھے لوٹ رہا ہے یارو

تو حافظہ اس قدر جواب دے رہا ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں آتا...... اتنا یاد آتا ہے کہ ۳۶ء، ۳۷ء میں پہلی مرتبہ میں نے مجاز کو دیکھا تھا اور اس وقت تابش نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس دور کے مجاز کو دیکھ کر یہ تصور نہیں کر سکتے کہ یہ شخص اب سے کچھ عرصہ پہلے جب علی گڑھ میں ایم۔اے میں پڑھتا تھا تو کس درجہ حسین اور تندرست تھا۔ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی پہلے ان پر۔ لیکن اب انہوں نے شراب نوشی زیادہ کر دی ہے اور یہ قبل از وقت بوڑھے ہو رہے ہیں۔ مجاز جس زمانے میں دلی میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کے پندرہ روزہ رسالے ''آواز'' کے اڈیٹر تھیاس سے بھی پہلے کی...... باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن یہ کسی طرح یاد نہیں آ رہا تھا کہ پہلی دفعہ میں کب، کہاں اور کیسے ان سے ملا۔ ہاں آخری ملاقات خوب یاد ہے، جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ۱۹۵۰ء میں جب وہ پہلی اور آخری بار پاکستان آئے اور کراچی سے لاہور پہنچے تو جہاں ان سے مڈبھیڑ ہوئی وہیں الیاس عشقی صاحب اور اظہار حسین کاظمی بھی تھے۔ انہیں دنوں یہاں لاہور میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک پروگرام نشر ہوتا تھا جس کا عنوان تھا ''بغیر عنوان کے''۔ اس پروگرام میں ان کے انٹرویو اور کلام کا ریکارڈ ریڈیو اسٹیشن میں تیار ہونا تھا۔ ریکارڈنگ سے پہلے لوگ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک صاحب نے کچھ انڈر گراؤنڈ قسم کی زندگی گزارنے والوں پر لعن طعن شروع کر دی۔ مجاز صاحب جو ہر بات کا ہمیشہ دلچسپ پہلو ہی دیکھنے کے عادی تھے ان سے کہنے لگے کہ صاحب ایک دن سب کو انڈر گراؤنڈ جانا ہے...... آج وہ کل ہماری باری ہے......! اس پر عشقی صاحب نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا اب اسی بات پر چائے پی جائے...... مجاز نے میری طرف حسرت سے دیکھ کر کہا...... اچھا صاحب چائے ہی سہی۔ گویا پینے کی کوئی چیز ہے تو شراب ہے، بھلا چائے کا پینا بھی کوئی پینا ہے۔ میں نے کہا یہ آپ نے پاگل خانے کی سیر بھی شروع کر دی ہے۔ کہنے لگے ہاں سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی۔ پھر یہ کہ ہم لوگوں کی قسمت میں اگر دیوان خانہ یا جیل خانہ نہیں ہے تو کیا پاگل خانے بھی نہ جائیں...... کوئی تو خانہ آخر ہونا چاہیے۔

پھر بہت دیر منٹو اور فیض کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ منٹو اس زمانے میں پاگل

خانے میں تھے اور فیض جیل خانے میں..... کہنے لگے جو لوگ ضرورت سے زیادہ سوچتے ہیں انہیں یا تو پاگل خانے جانا پڑتا ہے یا جیل خانے ..... پھر مجھ سے پوچھا سنا ہے تم نے شادی وادی کر لی..... کراچی میں کچھ لوگوں سے اس حادثے کی خبر مجھے ملی۔ میں نے کہا..... ہاں کہا..... یار یہ شادی کے بعد جو وادی لگی رہتی ہے اس سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ اس وادی میں پھنس کر انسان پھر کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ بچوں کو کندھے سے لگائے لگائے پھرنا پڑتا ہے۔

یہی سوچتے سوچتے صبح ہوگئی۔ اور میں نے خیال کیا کہ زیادہ نہیں سوچنا چاہیئے کیونکہ سوچتے ہی سوچتے آخر کار مجاز کے دماغ کی رگ پھٹ گئی لیکن لاہور کے صبح کے اخباروں میں دلی کے اخبار 'نئی دنیا' کے حوالے سے یہ خبر مجاز کے بارے میں چھپی کہ مجاز کا انتقال ۵ دسمبر کی رات کو بلرام پور اسپتال میں بہت پراسرار طریقے پر ہوا۔ ان کے جسم پر جلنے اور پٹنے کے نشان تھے۔ مرنے کی رات سے ایک رات پہلے وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ کسی شراب کی دوکان میں گئے تھے اور اس دوکان میں وہ صبح بے ہوش پڑے ہوئے ملے۔ ان کے ساتھ ایک اور ان کا کوئی ساتھی بھی بے ہوش پایا گیا۔ اور اخباروں میں چھپا ہے کہ جب وہ اس شراب کی دوکان میں گئے تھے تو ایک پہلوان بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسرارالحق مجاز کی اس پراسرار موت کا یہ پتہ اب تک نہیں چل سکا کہ کن وجوہ سے ہوئی اور یہ جسم پر ان کے چوٹوں کے اور جلنے کے نشان کیوں ہیں اور ان پہلوان صاحب کا اس حادثے میں کتنا ہاتھ ہے اور وہ ساتھی کون تھا جو ان کے ساتھ ہی اس شراب کی دوکان میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مجاز تو کسی سے کبھی اڑنے یا لڑنے والا آدمی تھا نہیں۔ اس نے تو اپنا پہلا دیوان '' آہنگ '' بھی ''کسی'' کے نام..... اس لیے معنون کیا تھا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے پائے اور بقول خود مجاز کے Free To Whome it Fits کا مضمون رہے۔ لیکن وہ جو گاندھی کے مرنے پر برنارڈ شا نے کہا تھا کہ زیادہ اچھا ہونا بھی ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا..... معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہوئی ہوگی۔ کاش مجاز اتنا اچھا بحیثیت انسان کے نہ ہوتا جتنا اچھا وہ شاعر تھا..... یا کاش وہ بقول خلیل صاحب اتنی زیادہ بیڑی اتنے کم وقت میں خرچ نہ کرتا۔ مسافر صاحب ٹھیک کہتے ہیں کہ کام کرنے کا وقت تو اصل میں چالیس سال کے بعد ہوتا ہے لیکن اس شخص نے زندگی کو کبھی زیادہ اہمیت ہی نہ دی اور غالب کی اس نصیحت پر عمل پیرا رہا ۔

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی

منٹو کے مرنے پر ابھی حال ہی میں کس حسرت سے مجاز نے کہا تھا۔

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

اور اب جو مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ مجاز پر کوئی مضمون لکھ دو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے یہ مضمون شروع کروں اور کہاں ختم کروں۔ مجاز نے اپنی زندگی میں جو فقرے کہے ہیں اگر وہی سب یک جا کر دیئے جائیں تو ایک خاصی ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی بن سکتی ہے لیکن مجھ جیسا فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں میں گرفتار کیسے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ میں مجاز پر مضمون لکھنے کی فرصت کہاں سے لاؤں...... یہاں تو دل کے خون کرنے تک کی فرصت نہیں۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

ماھنامہ ادب لطیف "، جنوری ١٩٥٦ء